مجاہد لکھنوی

ابنِ صفی

دُنیائے اسرار کا شہنشاہ

"جستجو"۔ تجسس۔ معلومات حاصل کرنے کی خواہش۔"

یہ وہ فطری جذبہ ہے جو ہر انسان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور اُسے اشرف المخلوقات بناتا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمارے دل میں اس جذبے کو خلق نہ کرتا تو ہم بھی ایک پتھر کی طرح جہاں رکھ دیے جاتے وہیں پڑے رہتے۔ یہ صرف تجسس کا جذبہ ہی ہے جو انسان کو جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کی دلیل اور ثبوت قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

"جب تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا گیا (تو اُس وقت) تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔" (مترجم)

جہالت اور لاعلمی کی اس سند کے بعد اگر انسان اپنی زندگی میں کچھ علم حاصل کرتا ہے، کسی درجہ پر فائز ہو جاتا ہے بلکہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو تعلیم دینے لگے تو اُس کے پیچھے صرف اور صرف ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ تجسس اور جستجو کا جذبہ۔

جاسوسی کا لفظ فی زمانہ جرم اور قتل و غارت گری تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی مجرم کی تلاش کو جاسوسی کہا جاتا ہے۔ کسی مجرمانہ کارروائی کی پہچان بین کو جاسوسی قرار دیا جاتا ہے۔ چھپ کر دوسروں کی ٹوہ لگانے کے مذموم فعل کو بھی جاسوسی تسلیم کیا گیا ہے جب کہ اس لفظ کے معنی بہت وسیع ہیں۔ عربی زبان میں "تجسس اور تجسسۃ" کے الفاظ نبض اور چھاتی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ انسانی جسم میں یہی دو مقام ہیں جہاں سے پورے نظام جسمانی کی کیفیت کا پتا چلتا ہے۔ قدیم دور سے آج تک ہر طبیب، ویدِ ڈاکٹر یا حکیم مرض کی تشخیص انھی دو مقامات سے کرتا ہے اگر ہم ان کے اس عمل کو بھی جاسوسی کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

"جاسوسی" کے جذبے کا ارتقاء انسان کے ادراک اور عقل و فہم کے مطابق ہوتا رہتا ہے۔ دُنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے وہ کان میں آنے والی آوازوں کی جستجو کرتا ہے۔ اُنھیں پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے (اسی لیے ہم بچے کی پیدائش کے بعد سب سے پہلے اُسے اذان سناتے ہیں) پھر تجسس کے اس عمل میں کانوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ آواز کو سُن کر اور پہچان کر نگاہوں کا اُس آواز کی طرف مُڑنا اس بات کا ثبوت ہے کہ صرف سُن لینے سے اُس کے جذبے کی تسکین نہیں ہوئی۔ یہ جاسوسی کی دوسری منزل ہوتی ہے۔ اس کے بعد لمس کا دَور آتا ہے اور بچہ جب کہ وہ چلنے پھرنے بلکہ رینگنے کے قابل بھی نہیں ہوتا مختلف لوگوں اور چیزوں کی طرف ہمکنا شروع کرتا ہے۔ اسی طرح جب وہ گفتگو کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو صرف سُن لینے، دیکھ لینے اور ہاتھوں سے محسوس کر لینے کے عمل سے بھی اُس کی تسکین نہیں ہوتی۔ اَب وہ سوالات کی بوچھار کر دیتا ہے۔ ماں۔ باپ یا جو افراد بھی اُس کے قریب ہوتے ہیں اُن سے وہ ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح اگر ہم انسان کو پیدائشی جاسوس کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

ان مثالوں کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ جاسوسی کو کوئی بُرا فعل قرار دینا یا اس عمل کو صرف "جرم" کے لیے مخصوص کر دینا غلط ہے۔ ہر قسم کے تحقیقی عمل کو، وہ علمی ہو یا ادبی، تاریخی ہو یا مذہبی جاسوسی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی واضح دلیلوں کے بعد بھی اردو ادب کی عظیم اور قد آور شخصیتوں نے جاسوسی کہانیوں کو ادبی تخلیقات میں شمار نہیں کیا۔ مستند و معتبر نقادوں نے اگر کہیں اُردو تحریر و تصنیف کی اِن نگارشات کا ذکر کیا بھی تو ایک جداگانہ فن کی حیثیت سے کیا اور یہ فاضل جاسوسی کہانیاں لکھنے والے

اہلِ قلم کے ساتھ بھی برقرار رکھا گیا جسے ایک انوکھے قسم کے تعصب کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن جاسوسی ادب" کے بادشاہ، شہرتِ دوام کے مالک ایشیا کے عظیم مصنف جناب ابنِ صفی نے صرف اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ ادب جو ایک مخصوص حلقے میں محدود رہے اور صرف کتابوں میں بند رہے مقبولیت کا حامل نہیں ہوتا بلکہ لازوال تحریریں وہ ہوتی ہیں جنھیں عوام کی اکثریت پڑھتی ہے۔

گزشتہ اڑتیس سال کے عرصے میں ہر ناقد نے دیکھ لیا کہ ابنِ صفی کی جاسوسی کہانیاں جس قدر اُن کی زندگی میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں اُسی طرح اُن کے بعد بھی مقبول ہیں۔ ابنِ صفی کو پڑھنے والوں کی بہت بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو اُن کی کتابیں بار بار پڑھتی رہی ہے جب کہ اس عرصہ میں قارئین کے مزاج میں بھی کئی انقلاب آچکے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ قارئین کی کئی صفیں نسلوں کی صورت میں تبدیل ہو گئیں مگر ابنِ صفی جہاں تھے آج بھی وہیں موجود ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم سے قبل طویل ناول پڑھے جاتے تھے پھر جنگ کے دوران جب لوگوں کے ذہن افراتفری کا شکار ہوئے اور اقتصادی و معاشرتی انقلاب نے لوگوں کو زیادہ مصروف اور عدیم الفرصت کر دیا تو افسانوں کے مجموعے پڑھے جانے کا زور بڑھ گیا۔ اسی دوران ابنِ صفی اپنی جاسوسی دُنیا کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ جاسوسی دُنیا طویل ناول اور مختصر افسانے کی درمیانی شکل تھی جسے قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے بعد ڈائجسٹوں کا دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ گزشتہ بیس سال کے عرصے میں پاکستان میں لاتعداد ڈائجسٹ شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں جس میں ہر قسم کا مواد شائع ہوتا رہتا ہے۔ ناشر حضرات اور مصنفین نے ہر نیا تجربہ کر کے دیکھ لیا یہ الگ بات ہے کہ اُن میں سے بعض نے اپنا ایک الگ مقام حاصل کر لیا لیکن ابنِ صفی کا مقام آج بھی برقرار اور جُدا گانہ ہے۔

یہی صورت قارئین کی ہے۔ گزشتہ اڑتیس سال میں دو نئی نسلیں پیدا ہو کر جوان ہو چکی ہیں جن میں دوسری نسل نے تو صرف ابنِ صفی کا نام سُنا ہے۔ نہ اُنھیں دیکھا نہ اُن سے ملی پھر بھی یہ نوجوان اُن کی تحریروں کے اس طرح دلدادہ ہیں جیسے وہ اُن کے اپنے دور کے مصنف ہیں۔ یہ نئی نسل بھی اُن کی تحریروں کی اتنی ہی شیدائی ہے جتنا کہ اُن کے بزرگ تھے۔

بات کچھ بے تعلق سی ہے مگر یہاں اس کا ذکر غیر مناسب نہ ہو گا کہ بھارت میں ایک فلم "مغلِ اعظم" بنی تھی۔ اس فلم کی تکمیل میں پورے دس سال صرف ہو گئے۔ جب فلم مکمل ہو کر نمائش کے لیے تیار ہو گئی تو ڈائریکٹر کے آصف نے "مغلِ اعظم" کے موسیقار نوشاد سے کہا کہ اس فلم کے گیت برسوں پہلے ریکارڈ ہوئے تھے۔ اس عرصے میں موسیقی کا انداز بدل چکا ہے اگر آپ چاہیں تو فلم کے گیتوں کو نئے انداز پر دوبارہ ریکارڈ کر لیں۔ اس کے جواب میں موسیقار نوشاد نے کہا کہ اگر آپ اس فلم کو مزید دس سال بعد ریلیز کریں تب بھی ان گیتوں کی مقبولیت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

یہ تھی ایک حقیقی فنکار کی پُراعتمادی اور یہی بات ہم ابنِ صفی کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے جو کچھ لکھا اس عزم اور اعتماد کے ساتھ لکھا ہے کہ انقلاب آتے رہیں، زمانے بدلتے رہیں مگر اُن کی تحریروں کی مقبولیت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ نسل در نسل لوگ اُنھیں پڑھتے رہیں گے۔

کسی ستون کی مضبوطی اور استحکام کا ذکر ہو تو اُن طوفانوں کی بات بھی کرنی پڑتی ہے جو اسے گرانے کے لیے ٹکریں مارتے رہے ہوں۔ خود ابنِ صفی اور اُن کی تحریروں کو بھی ایک لمبے دور سے گزرنا پڑا بلکہ واضح الفاظ میں کہوں تو کہوں کہ اپنی زندگی میں اُنھیں لاتعداد دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا یعنی بقول شیخ سعدیؒ "تو دہم ہمیشہ باہم پیشہ دشمن"۔

ابنِ صفی کے خلاف یہ سازش یہ دشمنی مختلف شکلوں میں سامنے آتی رہی جب تک ابنِ صفی پاکستان نہیں آئے تھے اور اُس وقت پاک و ہند کے درمیان کتب و رسائل کی ترسیل کا کوئی معقول انتظام بھی نہیں تھا اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھا کر چند چھوٹے موٹے ناشروں نے دو طریقوں پر اُن کی شہرت و مقبولیت سے فائدہ اُٹھایا ایک تو اُن کی کتابیں ناجائز طور پر چھاپ کر دولت کمائی دوسرے اُن لوگوں نے جن کے وسائل اتنے نہیں تھے کہ ابنِ صفی کی۔ ہندوستان میں شائع ہونے والی تازہ ترین تصنیف جلد سے جلد حاصل کر سکیں۔ اُنھوں نے مختلف اہلِ قلم سے ستودے لکھوا کر ابنِ صفی کے نام سے شائع کر دیے۔ بھیڑ چال کے تحت یہ فراڈ بیک وقت کئی افراد کرنے لگے۔ اُدھر نام سے دھوکا کھا کر قارئین کتاب تو خرید لیتے تھے لیکن جب تحریر پڑھتے تھے تو خود سمجھ لیتے تھے کہ یہ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔

بار بار دھوکے کھانے کے بعد بالآخر قارئین بھی محتاط ہو گئے اُنھوں نے ہر وہ کتاب خریدنا چھوڑ دی جس پر ابنِ صفی کا نام بحیثیت مصنف درج ہوتا تھا بلکہ اب وہ پہلے اصلی اور نقلی کی چھان بین

کرتے تھے۔ اس منزل پر پہنچ کر ناشر کو ناکامی ہوئی اور اُنھوں نے اس میں خیریت سمجھی کہ خود کو بے نقاب کر دیں۔ ابنِ صفی کے نام سے ملتے جلتے وہ نام جو قارئین کو دھوکا دینے کے لیے شائع کیا کرتے تھے اب اپنی کتاب پر پوری وضاحت کے ساتھ درج کرنے لگے۔

ناشروں کی اس کارروائی سے دو نتیجے نکلے ایک تخریبی اور دوسرا تعمیری۔ تخریبی عمل تو یہ تھا کہ فرضی مصنفین سے کہانیاں لکھوا کر اور اُنھیں ابنِ صفی یا اُن کے ملتے جلتے ناموں سے شائع کر کے لوگوں کو دھوکا دیا گیا اور ناجائز طور پر اُن کی جیبیں خالی کرائی گئیں جس کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا۔ نہ پڑھنے والے مطمئن ہوئے اور نہ ایماندار سنجیدہ اور معتبر ناشرین نے اس طریقے کو سراہا بلکہ جو لوگ یہ کاروبار کر رہے تھے اُنھیں نشر و اشاعت کے پیشے کے لیے ایک زہر قرار دیا گیا۔

دوسرا اور تعمیری نتیجہ جو سامنے آیا وہ یہ تھا کہ ابنِ صفی یا اُس سے ملتے جلتے فرضی ناموں سے لکھنے والے نو عمر مصنفین کی بھیڑ میں کئی ایسے بھی اُبھر کر سامنے آئے جو ابنِ صفی تو نہ بن سکے مگر اپنی تحریر کے منفرد انداز کا ایک جداگانہ تاثر قارئین کے ذہن پر چھوڑنے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ پھر جب وہ اپنے اصلی یا نقلی نام کے ساتھ اپنی تحریریں لے کر سامنے آئے تو اُن کے پڑھنے والوں نے اُنھیں بخوشی قبول کر لیا۔ اس طرح جاسوسی ادب کے تخلیق کاروں میں ایک اچھا اضافہ ہوا جس کا کریڈٹ بھی بالواسطہ ہی سہی مگر ابنِ صفی کو ہی جاتا ہے۔

لیکن وہی سوال پھر ذہن میں اُبھرتا ہے کہ اتنی شہرت، مقبولیت اور تحریروں کی اس بہتات کے باوجود ابنِ صفی کو اردو کا ادیب کیوں نہیں تسلیم کیا گیا اور اُن کی نگارشات کو اردو ادب کا ایک حصّہ کیوں نہیں مانا گیا؟ شاید اس لیے کہ ابتداء سے ہی جاسوسی تحریروں کو "درآمدی مواد" قرار دیا گیا ہے اور اس درآمد کا سہرا منشی تیرتھ رام فیروزپوری کے سر بندھتا ہے جنھوں نے انگریزی جاسوسی ناولوں کے لاتعداد اردو ترجمے کیے۔ آج سے تقریباً پچاس سال قبل تصانیف کی تعداد کے اعتبار سے مولانا صادق حسین صدیقی کے بعد تیرتھ رام فیروزپوری کا ہی نام آتا تھا اور شاید آج بھی بترتیب اپنے مقام پر قائم ہے۔

لیکن یہ خیال غلط ہے کہ جاسوسی لٹریچر انگریزوں کا عطیہ ہے اُس سے پہلے مشہور زمانہ کتاب "طلسمِ ہوشربا" جو سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور رجب علی سرور کی "فسانہ عجائب" ہمارے اردو ادب میں موجود تھیں۔ اُس کے بعد شہباز اور ہمدم کے نام سے وابستہ لاتعداد جاسوسی ناول بھی ملتے ہیں۔ یہ سب کتابیں ہماری اپنی تصنیفات تھیں۔ جن کا انگریزی جاسوسی ادب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

پھر بیسویں صدی کے چوتھے عشرہ میں ایک اور صاحبِ قلم ہمارے سامنے آتا ہے جس نے جاسوسی ادب میں کچھ نئے اضافے کیے۔ یہ خان محبوب طرزی ہیں جن کا شمار اپنے وقت کے بالکل ادیبوں میں ہوتا ہے۔ طرزی نے ایک سو سے زیادہ ناول لکھے ہیں۔

طرزی اور ابنِ صفی کے درمیان ایک قدر مشترک رہی ہے۔ طرزی ترجمہ کرنے کو اہلِ قلم کی کمزوری کہتے تھے۔ وہ طبع زاد تصنیف کے قائل تھے۔ آزاد ترجمہ کو بھی وہ بیساکھی پر چلنا کہتے تھے۔ ابنِ صفی بھی اسی راہ پر گامزن تھے۔ اُنھوں نے جو کچھ پیش کیا خود اپنے ذہن سے تخلیق کیا۔ طرزی کا انتقال ۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء میں ہوا اس وقت ابنِ صفی دُنیائے جُرم پر چھا چکے تھے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جاسوسی ادب میں اُن کا طوطی بول رہا تھا۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب لکھنؤ سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ اخبار "سرپنچ" کے مدیر شوکت تھانوی کے پاکستان چلے آنے کے بعد خان محبوب طرزی مقرر ہوئے تھے اور میں اُن کے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر کا کام کرتا تھا۔ دفتر کے اوقات کے علاوہ ... شام کو واپس آتے ہوئے بھی کچھ فاصلے تک ہم دونوں کا ساتھ رہتا تھا اور کبھی کبھی کچھ دیر ہوٹل میں چائے پینے کے دوران بھی ہماری گفتگو جاری رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کئی بار ہماری گفتگو کا موضوع ابنِ صفی اور اُن کی تحریریں رہتی تھیں۔ طرزی اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر ابنِ صفی کی ایک آدھ تصنیف کا ہی مطالعہ کر سکے تھے جس کے بعد اُنھوں نے درج ذیل تبصرہ کیا تھا جس کا ایک ایک لفظ آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔

"اگر اس شخص کو شہرت و مقبولیت کا بخار نہ چڑھا تو یہ کچھ کر جائے گا۔ یہ اپنے کرداروں پر بڑی مضبوط گرفت رکھتا ہے اور اُنھیں کہانی کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے لیکن وقت ایسے جینئس لوگوں کا ساتھ کبھی نہیں دیتا۔"

طرزی صاحب کی پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ ابنِ صفی کو شہرت و مقبولیت ایسی حاصل ہوئی کہ دُنیا دیکھتی رہ گئی لیکن وہ غرور و تکبر کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی اُنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو بیٹر رچیک کی طرح کیش کرا کے دولت سمیٹنے کی کوشش کی اور طرزی کی آخری بات کہ اردو ادب کے ناخداؤں نے ابنِ صفی کو وہ مقام نہیں دیا جو اُن کا حق تھا صحیح ثابت ہوئی۔

ابنِ صفی کے ہم عصر جاسوسی کہانیاں لکھنے والوں میں یوں تو بہت سے لوگ ہیں لیکن میری یادداشت میں صرف تین صاحبان

قلم ایسے تھے جنھوں نے مسلسل لکھا اور جاسوسی ادب میں کچھ اضافے بھی کیے۔ یہ اکرم الہ آبادی، عارف ماہروی اور اظہار اثر ہیں۔ ان تینوں میں اکرم الہ آبادی زیادہ پرانے اور مقبول تھے جنھوں نے خاصے عرصے تک قارئین کو اس فیصلے سے مجبور رکھا کہ وہ ابنِ صفی اور اکرم الہ آبادی میں سے کس کو افضل قرار دیں لیکن بالآخر ابنِ صفی نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا۔

اسی دوران انگریزی ناولوں کے ترجمے کا زور پھر بڑھ گیا۔ اب یہ ایک نئے رنگ کے ساتھ منظرِ عام پر آئے تھے۔ حیدرآباد (دکن) کے مظہر الحق علوی نے ڈراکولا، سونا سمندر، رات کا کالا کفن وغیرہ لکھ کر قارئین کو ایک نیا ذائقہ چکھایا۔ یہ ناول اپنی ہیبت ناکی کی وجہ سے خاصے مقبول ہوئے اور جاسوسی ناولیں پڑھنے والوں کا رجحان بدلنے کے لیے بہت کافی تھے۔ ایک بڑی تعداد نے عام جاسوسی ناول چھوڑ کر یہ ترجمے پڑھنا شروع کر دیے مگر واحد ابنِ صفی وہ ہستی تھے جو اس طوفان سے بھی متاثر نہ ہو سکے۔ اُن کا قاری ہر تجربہ کرنے کے بعد پھر انھی کے پاس پہنچ گیا۔

ابنِ صفی کے خلاف آخری یلغار پاکستانی ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی وہ طویل کہانیاں تھیں جن کی بنیاد ہندو میتھالوجی اور دیومالائی پس منظر تھا۔ اس راہ سے قارئین کو دو ذائقے پیش کیے گئے۔ ان کہانیوں میں حیران کُن واقعات بھی تھے اور سیکس کے چٹخارے بھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ یہ دوسری لذت ابنِ صفی کی کہانیوں میں تقریباً مفقود ہوتی ہے اس لیے قارئین انھیں بھول کر دیومالائی کہانیوں کی طرف راغب ہو جائیں گے۔

لیکن ایسا سوچنے والے یہ بات بھول گئے کہ ایک دھماکے کی آواز ایک لمحے کے لیے ضرور اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے پھر چند ثانیے کے اندر جب اُس کا ذہن اس نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ آواز ایک پٹاخے کی تھی تو وہ فوراً ہی دھماکے کو فراموش کر دیتا ہے۔ ویسے ہی سیکس ایک وقتی، لمحاتی، تصوراتی جوش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

ابنِ صفی کی ہر تحریر زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس کا ہر کردار ہمارا اپنا ساتھی محسوس ہوتا ہے جس کے لیے ہندو میتھالوجی کی طرح تصور کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، نہ کہانی کے کرداروں کا ساتھ دینے کے لیے کسی ذہنی سفر کی حاجت ہوتی ہے۔ اُن کا تحریر کردہ ہر واقعہ ہماری اپنی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی لیے ابنِ صفی کا قاری ہر دوسری تحریر کو سونگھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے کہ اچھے ذائقہ کے لیے تازگی بھی ایک شرط ہوتی ہے اور یہ تازگی یہ مہک پڑھنے والوں کو صرف ابنِ صفی کی تحریروں میں ملتی ہے۔

دل تو چاہتا ہے کہ ابنِ صفی کی ہر تحریر پر الگ الگ تبصرہ کروں، ہر کہانی کی تفصیل پیش کروں، اُس کی خصوصیات گنواؤں مگر میں اس منزل سے جان بوجھ کر خاموشی کے ساتھ گزر رہا ہوں اس لیے کہ یہ تفصیلات تو ابنِ صفی کے ہر قاری کے ذہن پر پہلے ہی نقش ہیں میرے چند الفاظ اس میں کسی اضافہ کا باعث نہ ہوں گے۔ پھر مشہور کہاوت ہے کہ۔

مشک آنست کہ خود ببوید۔ نہ کہ عطار بگوید

مشک وہی ہے جو خود خوشبو دے۔ یہ نہیں کہ عطار اُس کا تعارف کرائے۔

اپنی کہانیوں کی ابتدا میں ابنِ صفی نے جو "پیش رس" تحریر کیے وہ اپنا علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔ ان مختصر تحریروں میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ بہت سے عُقدے کھولے ہیں۔ اشاروں کنایوں میں بڑے بڑے مسائل حل کیے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر یہ "پیش رس" کی ان تحریروں کو مجتمع کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تو آج کی تصنیفات میں اس کتاب کو وہی حیثیت حاصل ہوگی جو ایک سو سال پہلے کے دور میں غالب کی اُردوئے معلّٰی کو دی گئی تھی۔

ابنِ صفی رُخصت ہو گئے لیکن اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ گئے عام طور پر لوگ مال و دولت جائیداد اور اولادیں چھوڑتے ہیں لیکن ... ابنِ صفی تو پوری ایک دُنیا چھوڑ گئے ہیں۔ اپنی ساری زندگی کا نچوڑ، اپنی ذہنی کاوشوں کا انبار اور اس کے ساتھ اپنے لاتعداد پرستار۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب اثمٹ اور لافانی ہیں اور اس کے ساتھ ابنِ صفی بھی ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

یہ ابنِ صفی کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں اپنے لاتعداد ہوا خواہوں کے ساتھ ساتھ ایک قدر دان، وفا شعار اور لائق شاگرد بھی مل گیا اور ابنِ صفی کی جوہر شناس نگاہوں نے اُسے پہچان بھی لیا۔ اگر ابنِ صفی اس پُرخلوص انسان پر اعتماد نہ کرتے تو اُن کی تحریروں کے خزانے کا بھی وہی انجام ہوتا جو اُستاد قمر جلالوی کے کلام کا ہونے والا تھا اور پھر شاید ہم اُن کی ایک ایک تحریر کو ہمیشہ ہمیشہ ترستے رہتے مشتاق احمد قریشی کو اس سلسلہ میں جس قدر سراہا جائے کم ہے کہ اُنھوں نے ابنِ صفی کی تحریر کردہ ایک ایک سطر کو محفوظ کر لیا اور انتہائی سلیقہ کے ساتھ اُن کے پرستاروں کی خدمت میں ماہ بماہ پیش کرتے رہتے ہیں ورنہ بصورتِ دیگر ہمارے درمیان سُرمہ خوروں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔